



”ترسک گاؤں کی چمنیاں دھواں اگلنے ہی والی ہیں۔“

آئے کہ انہیں مارنا ہی پڑے۔ اچھے بابا! ان کی داڑھی سفید ہے نا۔ سفید جو کہ تم کہتی ہو میری پٹلیوں کے اطراف قابض ہے۔ کیا تم مجھے ان سیبوں کے ڈیر تک لے چلو گی جسے لاد کر شہر لے جانا ہے۔ جو تازہ تازہ درختوں سے توڑے گئے ہیں؟“

اب مہتابی کو خاموش ہو جانا تھا۔  
”بولو بی بی، کیا تم ایسا نہیں کرو گی۔ کیا تم میری آنکھیں نہیں بنو گی؟“

”بنوں گی خواہ“ مجھے حدشہ خانم پیٹ ہی کیوں نہ ڈالیں۔“ مہتابی نے حقیقت اور امکان دونوں پیش کر دیے۔

”حدشہ ماں! وہ ایسا ضرور کریں گی۔ خدا کی محبت پر مجھے اعتبار ہے لیکن پھر بھی حدشہ خانم ہی میری ماں ہوتیں، کیا یہ ضروری تھا؟“ وہ دھاگے کو اپنی انگلی پر لپیٹنے لگی جس کے رنگ سے وہ نا آشنا تھی۔

”خدا کی محبت پر اعتبار ہو تو اس اعتبار کو کیا کیوں سے زائل نہیں کرنا چاہیے۔“

دینار نے اپنی نم آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے تھپکنا چاہا۔ ”ہوا میں رچی یہ خوشبو میں مجھے بے چین کر رہی ہیں بی بی۔“

”چلو میں تمہیں لے چلوں۔ آؤ پہلو۔ حدشہ خانم مجھ پر کیسی ہی سختی کیوں نہ کریں۔“

مہتابی ہر پیشکش پر حدشہ کا نام ایسے لیتی ہے جیسے حدشہ سے زیادہ وہ خود نہیں چاہتی کہ وہ باہر جائے۔ انجیر

سیب اور انجیر کے باغوں سے ذرا قریب اور ذرا دور پہاڑی دربانوں کی آنکھوں کے عین نیچے ترسک گاؤں کی کچی گیڈنڈیوں کو بچے اپنے پیروں تلے روندتے، میدان جنگ میں لوٹ مار مچانے والوں کی طرح شور برپا کرتے بھاگ رہے ہیں۔ وہ ابھی ابھی سیب کے باغ سے سیب چرا کر آئے ہیں۔ ان سرخ سیبوں کی تازہ خوشبو اڑ کر دینار سے ایسے لپٹتی ہے جیسے وہ خود بھی سیب چرا کر بھاگی جا رہی ہو۔

گول فریم پر پھول کاڑھتے اس کے ہاتھ رک گئے ہیں اور یوں اس ٹھہراؤ پر دھاگہ اس کی انگلی سے لپٹتا، تنبیہ کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ ”سنو دینار! کچھ تو اپنی بے نوریت کا خیال رکھو۔“

اس نے سر کو کھلی کھڑکی سے باہر نکالا اور دور و نزدیک کھیتوں اور میدانوں میں شور مچانے والوں کے قہقہے اور قلقاریاں سنیں۔

”بی بی مہتابی! ذرا بتاؤ تو یہ سب شرارتی بچے جب سیب چرا کر بھاگتے ہیں تو بیرام بابا ان کے پیچھے نہیں بھاگتے؟“

”کیوں نہیں! بیرام بابا ان کے پیچھے اپنی لاٹھی لے کر بھاگتے ہیں۔“

وہ ہنسی۔ ”لیکن بچے کیسے بیرام بابا کے ہاتھ آتے ہوں گے۔ بابا بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ کوئی ہاتھ نہ

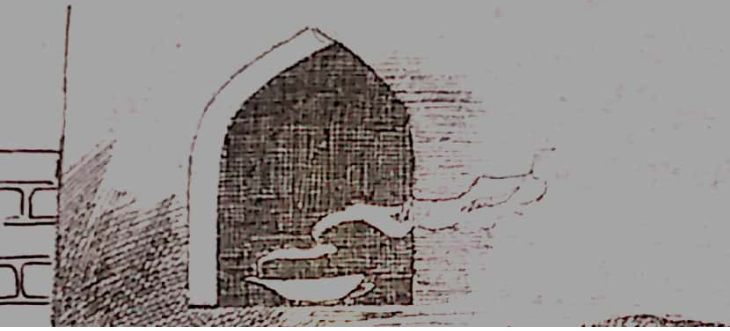


کے درختوں کے قریب جہاں گاؤں کے بڑے بوڑھے بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ دریا کے کنارے جہاں بچوں کو سارے کھیل سوجھتے ہیں۔ زلفیہ خانم کے تنور کے سامنے سے گزر کر جہاں عورتیں اپنے دن بھر کے کام ساتھ لیے بیٹھتی ہیں۔ آبشار کے پاس گھسے ہوئے بڑے پتھر پر جہاں عایچے پر بیٹھے ترسک کی جوان لڑکیاں مالٹے اور سیب کھاتی ہیں۔ پتھروں سے بنائے چولہے پر حلوہ بناتی ہیں، قہوہ کی پیالیاں بھر بھر کر پیتی ہیں اور شام ڈھلے اپنے ہاتھوں میں سوزنی کے شاہکار لیے اٹھتی ہیں۔ مہتابی نہیں چاہتی کہ ترسک گاؤں سے جڑے

اس گھر جس کی دیواروں کو کسی گھر کی ہسائیگی میسر نہیں ہے سے وہ اندھی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلے۔ وہ دینار سے محبت کرتی ہے اور بس اس محبت کی خاطر ہی۔۔۔ صرف محبت کی خاطر۔۔۔

”یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہ بھی تو ٹھیک نہیں ہوگا نامہتابی۔۔۔“ دینار کیسے چاہ سکتی تھی کہ حدشماں مہتابی کو برا بھلا کہیں یا پیٹ ہی ڈالیں یا انہیں جتا میں کہ کیسے خزاں کے دنوں میں انہیں بھوک سے مرنے سے بچانے کے لیے وہ انہیں اناج دیتی ہیں۔

”تھیکن میں نور و گل کی شادی میں تمہیں لے



جانے کا وعدہ کرتی ہوں۔ میری جان جائے یا مجھے حدیثہ خانم نکال دیں۔“ مہتابی وہ وعدہ بہت آسانی سے کر لیتی جس کی پاسداری کا وقت بہت دور ہوتا۔

”نور و گل اور ممیز۔“ اس نے دونوں کو ایک ساتھ سوچا اور یہ بھی کہ دونوں باغ میں چھپ کر ملتے ہیں۔ جیسا کہ باڑے کی صفائی کرنے والے لڑکے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ ”سارا گاؤں جانتا ہے کہ دونوں باغ میں چھپ کر ملتے ہیں۔ جب نور و گل ممیز کا دیا ریشمی رومال اپنے سر پر لپیٹ لیتی ہے تو سب جان جاتے ہیں کہ آج وہ آئے گا اور وہ آتا ہے۔ جنوب کی ہواؤں کو روک کر آنا ہوا شمال کی ہواؤں کو سوار بنا کر۔“ وہ آتا ہے۔ ”دینار ایسی سرگوشیاں سنتی ہے اور وہ پوری کہانی بنا لیتی ہے۔ وہ ممیز کے لیے دعائیں کرتی ہے کہ وہ جنوب کی ہواؤں کو روک کر شمال کی ہواؤں کو سوار بنا کر نور و گل کے لیے آجائے۔“

”کیا نور و گل اور ممیز کی شادی ہو جائے گی؟“

”ان کی شادی ضرور ہو جانی چاہیے۔ میں ممیز کو پسند کرتی ہوں، وہ خاندانی رجحانوں کو بے کار سمجھتا ہے۔“

”کیا نور و گل بہت دور دوسرے گاؤں چلی جائے گی۔“ دینار نے ایسی حدائی جو نور و گل کی ماں ہی اس کے لیے محسوس کر سکتی تھی سے دکھی ہو کر پوچھا۔ ایک ایسی سہیلی کے لیے جو بے قاعدہ بنی تھی نابا قاعدہ۔

”ممیز کے ساتھ اسے جانا ہی ہو گا دینار۔ یہی رسم ہے۔“

”پھر اس باغ کا کیا ہو گا جہاں وہ ملتے ہیں۔“ اس نے شرارتاً کہا۔ مہتابی ہنس دی۔

”میں نور و گل اور ممیز کی شادی میں ضرور جاؤں گی۔ بی بی۔ سن لو۔“

”میں ضرور لے جاؤں گی تمہیں، میں تو پہلے ہی وعدہ کر چکی ہوں۔“ مہتابی نے ہنسے بنا کہا۔ ایسی باتوں پر ہنسی کہاں آتی ہے۔

”حدیثہ ماں کے ساتھ جا کر میرے لیے ریشم لے آنا۔ معرفت خالہ کو دے آنا، گھنا اس پر ویسے ہی پھول

کاڑھ دیں جو سمرقند کے بازاروں میں جنت کے پہلوں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ میں نور و گل کی شادی میں ایک بہترین لباس پہننا چاہتی ہوں۔“

”میں ریشم لے جاؤں گی۔ مجھے ہفتی ریمک پند ہے، مدینہ نے اپنی شادی کے دن پہنا تھا۔“

دینار شرما گئی۔ کیسے اشارے سے مہتابی نے اس کی شادی کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ ٹھیک ہے اسے بھی ایک دن دلہن بننا ہے۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی اس دن کے خواب دیکھتی ہے۔ وہ رنگوں کو نہیں جانتی لیکن ان کے احساس کو جانتی ہے۔ وہ جان چکی ہے کہ دلہن رنگ سے نہیں سنگ سے بنتی ہے۔ پھر وہ کوئی بھی رنگ پہن لے وہ دلہن رنگ ہو جاتا ہے۔ ماں بھی اس کی شادی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ وہ ایک اچھے لڑکے کی تلاش میں بھی ہیں۔

”کس کی شادی کا ذکر کر رہی ہو مہتابی؟“ حدیثہ خانم کی کھردری گونج دار آواز نے دینار کے اندر سمٹ آئے عروسی رنگ کے احساس کو تہہ و بالا کر دیا۔ وہ سم گئی اور مہتابی بھی۔ وہ دونوں باتوں میں اتنی محو تھیں کہ گھوڑے کے ٹاپوں اور چمڑے کے سخت کھردرے چاپ سن نہ سکیں۔

حدیثہ نے دیر تک کھڑے کھڑے مہتابی کو گھور اور مہتابی نظریں چرا کر رہ گئی۔

”تم سے کتنی بار کہا ہے دینار کو ان منحوس گاؤں والوں کی باتیں نہ سنایا کرو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ میں گھوڑے پر اپنا سفر طے کرتی ہوں اور اپنی زمینوں پر قبضے کے مقدمے کو بھگت رہی ہوں اور مجھے ایک چابک کی ضرورت بھی درپیش ہے۔“

مہتابی خاموش رہی اور اٹھ کر اس کے غسل کے لیے پانی گرم کرنے لگی۔

”میں یہ اور برداشت نہیں کر سکتی“ دینار نے آہستگی سے کہا۔

چمڑے کے سخت کھردرے جوتے غصے سے چہل قدمی کرتے کرتے رک گئے۔

”آپ کو سادہ لوح گاؤں والوں کو ایسا نہیں سمجھنا



چاہیے۔ آپ انسانوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟

حدیث نے نخوت سے اپنی اندھی بیٹی کو دیکھا جو ہر بار یہی سوال نئے انداز سے کرتی تھی۔

”ایک عورت جو اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتی ہے اور شام ڈھلے گھر آتی ہے، اسے بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے کس سے نفرت کرنی ہے اور کس سے محبت۔ وہ دنیا کے کسی بھی عالم سے زیادہ جانتی ہے۔ تمہیں میرے علم کی قدر کرنی چاہیے اور تقلید بھی۔“

”میں نور و گل کی شادی میں جانا چاہتی ہوں۔“ اسے حدیث خانم کے علم کی قدر بھی نہ اسے تقلید کرنی تھی۔

”تم ضرور جانا اگر نور و گل تمہیں بلانے کی جرات کریں۔“

”ٹھیک ہے! آپ مجھ پر ایسے طنز کر سکتی ہیں لیکن ایسا آپ کی وجہ سے ہی ہے۔ وہ سب آپ کی وجہ سے مجھ سے دور رہتے ہیں۔“

”انہیں میری نفرت پر یقین ہے تو انہیں تمہاری محبت پر بھی اعتقاد ہونا چاہیے۔“

”آپ یہ جانتی ہیں کہ آپ کی زمینوں میں کب بیج ڈالا جائے گا، کب کٹائی ہوگی، کب شہر لے جایا جائے گا، کس کی زمین پر کیسے قبضہ ہوگا، قبضے کا مقدمہ کیسے جیتا جائے گا، لیکن یہ نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“

”میری اندھی بیٹی جو مہتابی کے ہاتھ چومتی ہے اور پہاڑوں سے ٹکرا کر آتی ہواؤں کے پیغام سنتی ہے۔ وہ کیا چاہتی ہے کہ میں بھی یہی سب کروں؟“

”میں ہواؤں سے باتیں کرتی ہوں، مہتابی کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتی ہوں۔ کیونکہ میں ایسا کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہوں۔“

”لوگ نہ ہواؤں سے باتیں کرتے ہیں، نہ ہواؤں سے باتیں اخذ کرتے ہیں اور نہ ہی عقیدت و محبت کو آنکھوں تک لے جا کر احترام سے نوازتے ہیں۔“

”میں آپ کی طرح دلائل نہیں دے سکتی۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں شادی کے گیت گانا چاہتی

ہوں۔ مجھے زلفیہ خالہ کے اس تنور کی قہریت درکار ہے جہاں گئے پاستل گاؤں میں آنے والے مہمان سب سے پہلے تناول کرنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ معرفت خالہ میری انگلی پکڑیں اور مجھے جنت کے پھول کاڑھنا سکھائیں کہ میں اپنے لیے اور آپ کے لیے ایک ایسا کرتا کاڑھ لوں جو ہمیں تنہائی کا احساس نہ دلائے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ میرا دل مچلا جاتا ہے کہ عزیزہ خالہ کی بیٹھک میں گاؤں بھر کی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر عظیم ڈاکو بسام کی شجاعت کے قصے سنوں اور یہ جان پاؤں کہ کیسے بسام نے ایک بوڑھے ضعیف کو اپنے کندھوں پر لا کر دریا پار کروایا تھا۔ کیسے وہ سمرقند کے سپاہیوں میں بھیس بدل کر گھس گیا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی جیسا کہ میں کسی کو بھی کبھی دیکھ نہیں پاؤں گی لیکن اگر میں اس بیٹھک میں موجود ہوں گی تو میں بسام کو اتنا جان لوں گی کہ مجھے اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں اس گھر کی گرمائش سے تنگ آگئی ہوں، مجھے کچھ تو سرد اور تازہ ہوا میں اکٹھی کرنے دیں۔“

کسی مغموم مغنیہ کی طرح وہ نغمہ سرا تھی جبکہ نیم گرم پانی میں پیر ڈیوئے بیٹھی حدیث نشست سے سر ٹکائے اونکھ رہی تھی۔ اس سے باخبر کہ ترسک گاؤں کے واحد قہوہ خانے میں چار مرد بیٹھے اسے گالی دے رہے ہوں گے۔

یوسف، سلیمان، حافظ، شہتاب۔ وہ ان کے ساتھ مقدمہ لڑ رہی ہے۔

اور حاتم بھی۔ وہ قہوہ خانے کا مالک ہے جس کے ساتھ اس کا کوئی مقدمہ نہیں اور رائد جو قہوہ کی پیالیاں پتھر کی سلوں پر رکھتا ہے، اور رائد کی ماں زلفیہ خانم جو تنور میں ایسے پاستل لگاتی ہے جیسے مالی باغ میں پھول لگاتا ہے۔ حاجت جو زلفیہ کا چچا ہے جسے ہر سال حدیث سے قرض کی ضرورت رہتی ہے۔ زریاب جو حاجت کا ہمسایہ اور ہم خیال ہے اور اس کی نیک سیرت بیوی قمری جو حدیث کو نیکی کی نیت سے بدعائیں دیتی ہے۔ اس نیک سیرت بیوی کا بھائی جو چمڑے کے جوتے بناتا



ہے اور انہیں مہنگے داموں گاؤں گاؤں بیچتا ہے اور گھر گھر گاؤں گاؤں بات بے بات جوتے بیچنے والا اور خریدنے والے اسے کوٹنے دیتے ہیں اور اس پر خدا کی لعنتیں بھیجتے ہیں۔

گھر گھر گاؤں گاؤں موسموں کی طرح وہ اسے بدل بدل کر کوٹنے اور بددعا میں دیتے ہیں۔

وہ عورت جو گھوڑے کو ایزد لگاتی ہو اور شام ڈھلے گھر آتی ہو۔ اچھا وہ کوئی اچھی عورت ہو سکتی ہے؟

وہ کئی غریب کسانوں کی زمینیں کم داموں پر ہتھیا چکی ہے۔ وہ مردوں سے مقدمے لڑتی ہے اور انہیں

اس سے بڑی گلی دیتی ہے جو وہ اسے دیتے ہیں۔ وہ قرضہ دیتی ہے اور سود سمیت واپس لیتی ہے ورنہ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ان کے گھروں کا مال اسباب

لوٹ لیتی ہے، گائے، بھینسیں، بھیریس اور صندوقوں میں بند چیزوں کا سامان۔ ورنہ عورتوں اور بچیوں،

چھوٹوں اور بڑوں کو وہ نوکرتا لیتی ہے۔ اور ان سے اس سے زیادہ کام لیتی ہے جتنے کے وہ قرض دار ہوتے ہیں۔

وہ سخت کے ہالے کو اپنے گرد کھینچ کر رکھتی ہے۔ وہ خزاں میں بھوکوں کی اور جاڑے میں بھشکر کر مرنے والوں کا پریش حال نہیں کرتی۔ وہ بندوق کھول لیتی

ہے، اسے صاف کر لیتی ہے اور اس میں بارود بھر کر اس کی نال کو انسان کی کپٹی پر رکھ دیتی ہے۔ وہ کئی باغوں کی

کھیتوں کی، گوداموں کی اور انسانوں کی مالک ہے اور اپنے حکم کی تکمیل کروانا جانتی ہے۔ اس کا گھر گاؤں

سے الگ تھلک کنارے پر ہے پھر بھی وہ پورے گاؤں کا چکر کاٹ کر، پگڈنڈیوں کی دھول اڑا کر نگلیوں میں

ٹاپ کر گھر آتی ہے۔ اور پھر یوں ترسک گاؤں اور اس پاس کے سب ہی گاؤں والے اس سے نفرت کرتے

ہیں۔ وہ ایسی عورت کو ناپسند کرتے ہیں جو بیوہ بن کر نہیں رہی بلکہ جس نے آقا بننے کی ٹھان لی۔

اکثر وہ رات میں اپنی روسی ساختہ بندوق میں کار توں بھر بھر کر اسے بلند پہاڑوں کے رخ پر داغتی ہے۔ چیز اور پہاڑی جھاڑیوں سے گھرے ترسک کے سنانے میں ایک للکار پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتی،

سونے والوں کے اور جاگنے والوں کے کہیں پورے گاؤں میں چنگاری کی لہریں کرکڑکتی ہے کہ گاؤں سے جڑ لیکن گاؤں سے پرے اس گھر کی طرف دیکھنے کی جرات ہے کسی میں؟ جہاں ایک جوان اندھی لڑکا اپنے گال کے نیچے دونوں ہتھیلیاں رکھ کر سوتی ہے جو کہ ارض پر موجود کسی بھی معصوم سے زیادہ معصوم ہے۔ جو مرغزاروں کے ان گیتوں کو سننے کی منتی ہے جو اسے سنانے کے لیے کوئی راضی نہیں ہے۔ جوان سیلیوں سے باتیں کرتی ہے جو ترسک میں اس کے لیے موجود نہیں اور ان بیماروں کے لیے دعا کرتی ہے جن کی عیادت کے لیے وہ نہیں گئی۔ جو لواحقین کے ساتھ آنسو بہاتی ہے اور مرنے والے کے لیے دعا کی مغفرت کرتی ہے۔

وہ ایک اور گولی داغتی۔۔۔

ہے کسی میں ہمت کہ وہ اس گھر کی طرف دیکھے جس نے جوانی میں ہی بیوگی اوڑھ لی۔ جس کے اطراف انگوروں کی بیلیں اور پھولوں کی کیاریاں نہیں سرکنڈوں کی باڑیں لگانی پڑیں۔

ایک اور گولی ترسک کے قہوہ خانے میں بلند قہقہے لگاتے مردوں کو للکارتی۔۔۔

”جاؤ اور سو جاؤ۔۔۔ وہ سب جو جاگ رہے ہو، یہ ارادہ باندھے کہ کبھی وہ پیچھے سے یا آگے سے مجھے آلیں گے۔ میرے گھوٹوں کو باڑے میں سے لے آئیں گے اور میری بندوقیں دیواروں پر نمائش کے لیے لٹکی رہیں گی اور پھر مجھے چلا چلا کر ترسک والوں کو اپنی مدد کے لیے بلانا پڑے گا۔ مدد کی مجھے صرف اسی وقت تک ضرورت تھی جب۔۔۔ مجھے یہ احساس دلایا جا رہا تھا کہ میں اکیلی ہوں اور میرے ساتھ کچھ بھی ہو جانے کے کتنے امکانات ہیں۔“

\*\*\*

مہتابی بچپن سے اب تک دینار کی ہم زاد رہی تھی۔ اسی نے دینار کی انگلی کی نوک پر اپنی انگلی کی نوک رکھ رکھ کر اسے کاڑھنا سکھایا تھا۔ بھدے ہی سہی لیکن وہ



کیونکہ اگر مجھے یہ ادراک ہو چکا ہے تو انہیں کیوں نہیں...

کبھی کبھار وہ مہتابی کے گھر چلی جاتی۔ اس کی بہو تیز مزاج کی عورت تھی۔ وہ گاؤں بھر میں کسی کو بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ دینار اس کے بچوں سے کھیلنے کے لیے مچلتی تھی لیکن وہ اپنے بچوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہتی۔ پھر جب وہ مہتابی کا ہاتھ پکڑ کر گھر واپس آتی تو وہ اس زور سے دروازہ بند کرتی جیسے اب دوبارہ کبھی نہیں کھولے گی۔ اسے مہتابی کے لیے افسوس ہوتا جسے ہر رات ایک ایسے گھر میں واپس جانا پڑتا تھا جہاں اس کے لیے خوش دلی سے دروازہ نہیں کھولا جاتا تھا۔

آج دینار باغ میں آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نور و گل سے ملے، اس سے ہمیشہ کی باتیں کرے اور یہ جانے کہ کس چیز نے ان دونوں کو ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا کیا۔ اس نے بہت مشکل سے مہتابی کو منایا تھا۔ وہ حدیثہ خانم سے ڈرتی تھی لیکن دینار سے پیار کرتی تھی۔ اس کی محبت میں وہ بہت مجبور ہو جاتی تو اس کی مان لیتی ورنہ وہ بھی بہت بہانے کرتی۔

”سلام بخیر بیرام بابا۔“ مہتابی نے تیزی سے کہا اور اس کے ہاتھوں کی تیز تیز سرسراہٹ دینار نے محسوس کی۔

”تم... اس کے ساتھ... کیوں آئی ہو یہاں۔“ بیرام بابا نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

”سلام بیرام بابا! میں سیب چرانے نہیں آئی۔ میں تو باغ کی سیر کے لیے آئی ہوں۔ مہتابی بی بی بتا رہی تھیں کہ سارے شرارتی بچے آپ کے لیے درد سر بنے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت نہیں ہے۔ بچے یہ سب نہیں کریں گے تو وہ بچے نہیں رہیں گے۔ مجھے کتنی خوشی ہے آپ سے ملنے کی میں بتا نہیں سکتی۔ کاش میں یہاں روز آجایا کروں اور اس باغ کی لطیف خوشبوؤں کو اپنے ساتھ لے جایا کروں۔“

اس دوران مہتابی کے ہاتھوں کی تیز تیز سرسراہٹ بھی اس کی گفتگو کا حصہ بنتی رہی کہ جیسے ایک طرف

پھول اور پتے، شاخیں اور بیلے بنالیتی تھی۔ اسی نے اسے بتایا کہ گاؤں میں کتنے گھر ہیں اور ان گھروں میں کتنے اور کیسے لوگ رہتے ہیں۔ نور و گل کی کتنی ہم جولیاں ہیں اور کب تک وہ سب رخصت ہو جانے والی ہیں۔ ریشمی رومالوں اور اپنی جرابوں میں آج کل کن نمونوں کی مانگ ہے۔ شمش گل اور گلنار اس کی ہم عمر ہیں، مغفرت، ایدین، ظریفہ، اس سے چھوٹی ہیں۔ پیام، بیدال، سکندر گھڑوڑ کے لیے شہر جانے والے ہیں۔ گاؤں کے گاؤں انہیں رخصت کرنے کے لیے تیار، لیے آنے والے ہیں۔

”دینار نے رنگ اور ذرے، احساس اور جذبے، مہتابی کی سوئی سے ہی اپنے اندر پروئے تھے۔“

مہتابی دینار کی دیکھ بھال کے لیے رکھی گئی ملازمہ تھی جو اب تک اس کے ساتھ تھی۔ حدیثہ کو مہتابی کی موجودگی کچھ خاص پسند نہیں تھی لیکن دینار کے لیے وہ مہتابی کو برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ اگر دینار اندھی نہ ہوتی تو مہتابی بھی وہاں موجود نہ ہوتی۔ حدیثہ کو افسوس تھا کہ ان کی اکلوتی اولاد نہ صرف اندھی ہے بلکہ حد درجہ اندھی ہی ہے۔

کئی بار جب وہ اپنے ہم عمر بچوں کا شور سن کر دیواریں ٹٹول ٹٹول کر باہر ان تک جایا کرتی تو شور یک دم ٹھم جاتا جیسے کچھ طے کیا جا رہا ہو۔ پھر اسے کچھ پتھر اپنے پیروں کے پاس گرتے ہوئے ملتے۔ مہتابی اسے اندر لے جاتی۔

”یہ گاؤں بھر کے شرارتی بچے ہیں دینار! ان تک رسائی نہ کرو، وہ تمہیں نقصان پہنچا دیں گے۔“ لیکن وہ میرے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں؟“ وہ بچے ہیں اور انہیں ابھی یہ نہیں سکھایا گیا کہ بے نور آنکھیں رکھنے والوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے۔“

”کیا وہ بے رحم ہیں؟“

”وہ بچے ہیں۔ وہ رحم اور بے رحمی کا ادراک نہیں رکھتے۔“

”اگر وہ میرے ہم عمر ہیں تو انہیں یہ ادراک ہو گا



دینار بول رہی ہے اور ایک طرف متابی اپنے ہاتھوں سے کلام میں مصروف ہے۔

”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“ دینار نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سب دیکھ لیں کہ وہ مسکرا سکتی ہے اور خوش اخلاقی سے ان سب کا خیر مقدم کر سکتی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے حدیث اور دینار میں فرق ہے۔

”میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں متابی۔۔۔“ بیرام بابا کی کچھ خفا، کچھ تلخی سی آواز منتشر ہوئی۔

”ہاں پھر میری عزت کے لیے ہی۔۔۔ میں۔۔۔ میری۔۔۔“

کیسی آواز تھی متابی کی۔۔۔ دھیمی اور کپکپاتی ہوئی۔۔۔ ہاتھوں کی سرسراہٹ بھی کتنے عجیب ترچے کرنے لگی تھی۔

”آندر چلیں دینار۔“ آخر کار متابی کی آواز سے کپکپاہٹ دور ہو گئی۔

”بیرام بابا کہاں ہیں۔ انہوں نے میری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے سلام کا بھی۔“

”وہ مستقل تمہاری باتوں پر سر ہلا رہے تھے۔ دراصل ان کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ باغ کے رکھوالے ہیں۔ وہ اپنی توجہ باغ سے نہیں ہٹا سکتے۔ باغ کے کسی گوشے سے انہیں کسی کے کودنے کی آواز آتی تو وہ اس طرف تیزی سے بھاگ گئے۔“

”ایسا ہی ہے۔ میں نے کسی کو تیزی سے جاتے محسوس تو کیا۔ کیا بیرام بابا نے اجازت دے دی؟“

”ہاں خوشی سے۔۔۔ آندر چلیں۔۔۔“

”کیا نورو گل آج آئی ہوگی؟“

”شاید۔۔۔“

”سلام بخیر متابی خالہ۔“ نورو گل کی آواز آئی۔

”یہ نورو ہی ہے نابی بی۔ ہاں یہ وہی ہے۔ اسی کی آواز ایسی خوش کن ہے۔“

”اسے کہاں لیے گھوم رہی ہیں خالہ۔“ اس کی آواز میں تسخر کا پہلو زیادہ نمایاں تھا یا تلخی کا۔ دینار

جانچ نہ سکی اور دکھ سے خاموش ہو گئی۔ ”شاید ممیز کے انتظار نے اسے نمکین کر دیا ہے۔“ دینار نے سوچا۔

متابی کے ہاتھ پھر سے تیزی سے چلتے محسوس ہوئے۔

”کیا ہوا متابی! کیوں ہلکان ہو کر ہاتھ چلا رہی ہو؟“ دینار ہنس دی۔ ”یوں لگتا ہے اشاروں میں کسی سے بات کر رہی ہو۔ تم نے کبھی بتایا نہیں۔ کیا گاؤں میں کوئی گونگا بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے متابی خالہ۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ نورو گل صبح جو لیکن تلخی سے معمور آواز آئی۔

”نورو گل! ادھر آؤ مجھے اپنا ہاتھ دو۔ میری سہلی پر جاؤ۔ میں تمہیں شادی کی دعا دیتی ہوں جس سے تمہارا دل آباد رہے۔“

”مجھے تم سے کوئی دعا نہیں چاہیے۔“

خاموشی رہی پھر نورو گل کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے۔“

متابی خالہ۔۔۔ ٹھیک ہے۔ آپ کی عزت کے لیے ہی سہی۔“ نورو گل نے اپنا ہاتھ دینار کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کیا ہم اب سہیلیاں ہیں؟“

نورو گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”تم میری شادی

میں آ سکتی ہو۔“ اس نے اتنا کہا اور پھر۔ ”ممیز کا کہنا

ہے کہ ہماری شادی میں سارا گاؤں شریک ہونا چاہیے

کیا دوست کیا دشمن۔ وہ تو یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم باہم

ڈاکو کو بھی کسی طرح شریک کی دعوت دے دیں لیکن

وہ ہنس دی۔ شاید تسخر سے شاید شرارت سے۔

”تم ہی ٹھیک ہو۔“ وہ کچھ دیر بعد یہ کہہ پائی۔

”میں ضرور آؤں گی۔ ممیز کا شکریہ۔ میں تمہارے

لیے ایک کرتا کاڑھوں کی جس پر کھلے پھول بھی نہیں

مرجھائیں گے۔“

متابی نے عجلت کا مظاہرہ یک دم کیا۔

وہ دونوں حدیث کی آمد سے پہلے گھر آ گئیں۔ دینار

کے گاؤں کی مٹی سے اٹے جوتے صاف کر دیے گئے

تھے۔ اسے ایک سہلی مل گئی ہے اور اسے اب اس کی



ایک ظالم ماں۔۔۔ آپ ظالم ہیں۔۔۔ بہت ظالم۔۔۔ سب کے لیے ظالم۔۔۔

حدیثہ نے کسی قدر دلچسپی سے دینار کو دیکھا جو بے نور آنکھیں لیے ظلم کی تفسیر بیان کر رہی تھی۔ اسے اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کی بیٹی اسے کیا کہہ رہی ہے کیونکہ حقیقت الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کی بات کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں جس نے ہاڑوں میں اڑنے والے چند پرندوں کی آوازیں سنی تھیں اور گھر میں بیٹھ کر بدلتے موسموں کے مزے چکھے تھے۔

”ٹھیک ہے میں ظالم ہوں۔۔۔ لیکن اکیلی میں ہی نہیں ہوں۔۔۔ جب تمہارے سر کے بال سفید ہونے لگیں گے تو تم جان جاؤ گی کہ ہم سب موقعے کی تلاش میں ہوتے ہیں اور پھر ہم سب تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ اگر میں بری ہوں تو مجھ سے زیادہ برے بھی موجود ہیں۔۔۔ ان بروں سے زیادہ برے بھی۔۔۔ اور پھر ان سب سے بھی زیادہ۔۔۔ ایک سے بڑھ کر دوسرا ہمیشہ موجود رہتا ہے۔۔۔



”مہتابی! بنفشی گل کی شادی سر پر ہے، اناج کی صفائی کے لیے تمہیں آنا ہو گا۔“ گھر سے باہر مہتابی اسے کچھ دیر کے لیے لے کر نکلی تھی کہ دور سے کریمہ نے اسے دیکھ کر بلند آواز سے کہا اور چلی گئی۔

”بنفشی گل کی شادی ہے بی بی مہتاب! کب؟ وہ میری ہم عمر ہے، مجھے اس کی شادی میں ضرور جانا ہو گا۔ کیوں بی بی، کیا بنفشی کی والدہ مجھے بلائیں گی؟“

”حدیثہ خانم تمہیں نہیں جانے دیں گی میری بچی۔۔۔“

”میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے جانا ہے۔ چاہے کیسا ہی بدنصیب ہو کر کیوں نہ جانا پڑے۔“

مہتابی خاموش ہو گئی۔

”مجھے بنفشی گل کے دولہا کا نام پھر سنے بھول گیا۔ ایسے انسان کا نام کیسے بھولا جاسکتا ہے جس کی شجاعت

شادی میں بھی تو جانا ہے۔ خوشی سے وہ اتنا کھانا کھا گئی کہ حدیثہ نے اسے غور سے دیکھا اور پھر مہتابی کو۔ پھر اس نے آتش دان میں جلتی لکڑیوں کو بے دردی سے کھرچا اور اتنی آگ بھڑکادی کہ مہتابی کو لگا سا راکھ جل ہی جائے گا۔ کتنی سے جوتے اتارے بنا کہ جیسے اسے کسی اگلے محاذ پر لڑنے جانا ہے وہ بستر پر گر گئیں۔ دینار خاموشی سے گود میں ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی اور مہتابی گرم کمرے میں ٹھنڈی آپہن بھرنے لگی۔

دینار کو اپنی ماں کے کھدوے رویے سے جڑ تھی۔ مکہ نفرت۔ اگر وہ حدیثہ ماں کے بجائے کسی غریب توہ لسان یا باغ کے رکھوالے کی بیٹی ہوتی تو خوش ہوتی۔ مہتابی کے کمرے میں شہر کی لائی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس میں اس کی چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے بہترین ریشم اور کھواب تھے اور ان پر نیل بوٹے کی ڈالنے تھے جو نیکنوں سے دکتے تھے جیسا کہ مہتابی بتاتی تھی۔ لیکن اسے ان سب سے کیا۔ وہ حدیثہ ماں کے ساتھ شہر گئی تھی لیکن شہر کے شور نے اسے متاثر کیا۔ وہ یہ سوچے بنا نہیں رہ سکی کہ جس زمین پر پیدا ہوتے ہیں دراصل وہی زمین ہمارے اطمینان کا باعث ہے۔ خوشی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ جہاں بے جڑ ہو وہیں ہماری افزائش ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اپنا خوش نہ رہ سکیں جہاں پیدا ہوئے ہوں تو وہاں بھی رہ سکتے جہاں مرنے تک کے لیے جا بھڑے ہوں۔

دنوں دنوں نور و گل کی شادی تھی۔ حدیثہ ماں اسے نہیں لے گئیں۔ انہیں کچھ زیادہ دن شہر میں رہنا تھا اور ان کو اتنے دن تک ترسک میں اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔ دینار پوری جان سے روٹی رہی اور کھانا ترک کر دیا۔

”کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ میں اپنی سہیلی کی شہر میں شرکت کروں؟“

”ہاں سہیلی کوئی سہیلی نہیں ہے۔ تمہارا اگر کوئی ہے تو وہ۔۔۔“

میری بدنصیبی ہے کہ آپ میری ماں ہیں۔۔۔



زبان در زبان سفر کرتی ہر سماعت سے کلام کر چکی ہو۔  
 ”اس کا نام شہپر ہے۔ وہ ایک فوجی ہے۔ اس نے  
 سرحد پر اپنے سینے پر گولی کھائی ہے، اپنے زخموں کو  
 دشمن کی طرح شکست دی ہے۔ کریمہ کے پیر زمین پر  
 نہیں ٹکتے۔ وہ خود اقرار کرتی ہے کہ بیٹی کے اس رشتے  
 کے بعد سے اس نے زمین پر پاؤں نہیں رکھے۔ اپنے  
 واپاد کو دینے کے لیے اس نے بہت کچھ اکٹھا کر لیا ہے۔  
 بنفشی گل ایک ایسا قالین بنا رہی ہے جسے دیکھ کر یقین  
 نہیں آتا کہ انسانی ہاتھ ایسا کمال کر سکتے ہیں۔ وہ اس  
 کے جینز کی سب سے بہترین چیز ہے۔ خدا اسے خوش  
 رکھے۔“

”کاش میں وہ قالین دیکھ سکتی۔ کیا میں اسے چھو  
 بھی نہیں سکتی؟“  
 ”جینز کی چیزوں کو احتیاط سے رکھا جاتا ہے دینار۔“  
 ”تو پھر ہم شادی میں جائیں گے۔۔۔ ہے نا؟“  
 ”اگر حدیثہ خانم گھر میں موجود ہوئیں تو؟“  
 ”اگر وہ ہوئیں تو بھی اگر نہ ہوئیں تو بھی مجھ پر اور  
 سختی نہیں کی جاسکتی۔“ اس کے انداز میں کامل ضد  
 تھی۔

اور پھر بنفشی گل کی شادی کا دن بھی آگیا۔۔۔  
 حدیثہ دوسرے گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ دینار نے  
 بنفشی کی شادی میں جانے کی ساری تیاری کر لی تھی۔  
 جیسا کہ مہتابی نے کہا اس نے دلہن رنگ پہنا تھا۔ تحفے  
 کے طور پر اس نے حدیثہ کا خاص اس کے لیے سمرقند  
 سے منگوایا کرتا نکالا تھا۔ اس نے مہتابی سے خود کو  
 خاص انداز سے تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ سر پر اس  
 نے گہرا گلابی رومال لپیٹا تھا جس کے کنارے کنارے  
 جڑے سنہری ستارے اس کی گلابی پیشانی پر فخر سے  
 جھلملا رہے تھے۔

”کیا میں شادی میں جانے کے لائق ہو گئی ہوں بی  
 بی؟“

”ہاں! جیسے صرف تم ہی۔۔۔“  
 ”میں چاہتی ہوں ان سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ  
 میں ان کی خوشی میں کس قدر خوش ہوں۔“

”وہ تمہاری آمد کے منتظر ہوں گے۔“  
 ”پھر یقیناً گاؤں کے دوسرے لوگ بھی مجھے  
 شرکت کی دعوت دیا کریں گے۔“  
 ”ایسا ہو ہی جائے گا۔۔۔“

”اگر ماں آگئیں تو بھی میں شادی کے گھر سے  
 جلدی نہیں آؤں گی۔ حتیٰ کہ ماں اگر مجھے گھسیٹ کر  
 لے جانے پر بضد ہوئیں تو بھی۔“

”کریمہ نے کہا کہ اسے تمہارا انتظار رہے گا میری  
 بیٹی۔ اس کے لیے یہ بات باعث فخر ہے۔ اس نے کہا  
 میں دینار کو اپنے ساتھ لاسکتی ہوں۔“

مہتابی نے اس کے گالوں پر ہلکا سا غازہ لگا دیا۔ دینار  
 کی خوب صورتی کے چرچے ہر زبان پر رہے تھے کہ وہ  
 اپنی ماں سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اگر اس کی  
 آنکھوں کا نور قائم رہتا تو اسے کوئی شہزادہ بیاناے آتا۔  
 اگر کوئی شہزادہ نہ آتا تو وہ اپنی ماں سے زیادہ ظالم ہوتی۔  
 پھر وہ ہندو ق سے گولی نہ داغا کرتی، بس اشارہ کیا کرتی اور  
 تباہ کر دیا کرتی۔

شادی کا گھر گاؤں بھر کے لوگوں کی موجودگی اور  
 آوازوں سے اس سے کہیں زیادہ پر رونق تھا جتنا دینار  
 نے تصور کیا تھا۔ اس کا شانہ کئی ایک سے نکرایا اس کا  
 سر اور گھٹنے بھی اس پر بھی وہ خوش ہوئی جیسے یہ بھی  
 شادی کی کوئی رسم ہو۔

سب مہتابی سے سلام دعا کرتے اور دعائیں لیتے  
 رہے۔

”کسی نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“ دینار  
 نے اداسی سے کہا۔

”وہ تمہیں مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں دینار! میں  
 بڑی ہوں میری عزت کے لیے مجھے سلام کرنا ضروری  
 ہے۔“

وہ لڑکیوں کے حصے میں آئیں جہاں دلہن کو تیار کیا  
 جا رہا تھا اور روایتی گیت گائے جا رہے تھے۔ دینار کو دیکھ  
 کر گانے والیوں کی آواز اچھبے کا شکار ہوتی معمولی سے  
 وقت کے لیے رک گئی۔ پھر ان ہی سب لڑکیوں نے  
 عجیب و غریب قہقہے لگائے۔



”ہم اپنی زبان سے نہیں پھر سکتے۔۔۔ میری ننھی بنفشی گل۔۔۔  
میری بنفشی۔۔۔“

کریمہ جو اولین وقت سے حالت رکوع میں کھڑی تھی روتے ہوئے بولی۔

”انہوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے انہیں سزا ملنی چاہیے۔۔۔“ یہ یوسف تھا جو ابھی تک مقدمہ ہارنے کی وجہ سے راتوں کو سو نہیں پاتا تھا اور نئے نئے طریقوں پر غور کرتا تھا کہ حدیثہ کو کیسے زچ کرے۔ کیسے اس سے بدلہ لے اس کی زمینوں کو ہتھیالے۔

”ہم ان کا سامان سفر غصب کر لیں گے، پھر انہیں مشقتیں جھیلنے سنتاں واپس جانا ہو گا۔“

”وہ یہاں آئیں گے تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔ بارات خالی ہاتھ لوٹائی جائے گی۔ پھر وہ سنتاں والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ان کی سات نسلیں یاد رکھیں گی کہ کیسے ترسک کے باشندوں نے انہیں ذلیل و خوار کر کے نکالا تھا۔“ حاتم نے جو بنفشی گل کے تیاہیں یوسف کے خیال کی تائید کی۔

”ان کی آئندہ نسلوں کو یاد رکھنا ہی ہو گا کہ کیسے ترسک والوں نے انہیں منہ توڑ جواب دیا۔ کیسے انہوں نے ان ہی کی بازی پلٹ دی۔ انہوں نے جھوٹ بولا۔ انہیں لگا کہ پھر اپنی عزت کے نام پر ہم خاموش رہیں گے اور لڑکی کا نکاح کر دیں گے۔ وہ ایک کبڑا بڈھالائے ہیں ہم انہیں ایک اندھی دیں گے۔ وقت آگیا ہے کہ دونوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ بارات کو آنے دو۔ سب مل کر اس کا خوش دلی سے استقبال کرو۔ پھر نکاح کے بعد ہم انہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔“

”حدیثہ ہمیں مار ڈالے گی۔“

”مار ڈالے لیکن پھر وہ کیا کر لے گی۔۔۔ بلبلائے گی۔۔۔ اسے بلبلانا چاہیے۔۔۔ یہ وہ چوٹ ہو گی جو ہماری ساری چوٹوں کا بدلہ لے لے گی۔“

موسیٰ یوں کے باڑے میں جہاں خشک لکڑیوں کا ڈھیر آگ جلانے کے لیے رکھا تھا انہوں نے یہ طے کیا۔

”مہتابی خالہ!“ کہیں کسی کو نے سے ہونہ میں لٹی سوالیہ صورت یہ آواز آئی ہی تھی کہ مہتابی فوراً بولی۔  
”مجھے اور دینار کو کریمہ خانم نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔ ہم بنفشی کے لیے نیک تمنائیں لائے ہیں اور شہپر کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔“

دینار نے مہتابی کے ساتھ مل کر دلہن کو اس کا تحفہ دیا۔ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ وہ دلہن کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی لیکن مہتابی اسے دوسری طرف لے کر بیٹھ گئی۔ دینار لڑکیوں کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے تھوڑے بہت یہ گیت آتے تھے جو مہتابی نے اسے سکھائے تھے۔ ان سب کو بارات کا انتظار تھا۔ بارات جو دو دن اور تین راتوں کی مسافت طے کرتی آرہی تھی۔ وہ راستے میں دو سراؤں میں قیام کر چکے تھے۔ اب بارات دلہن کے گھر کی طرف آرہی تھی۔ روانہ ہو چکی اس بارات کی آمد سے پہلے کریمہ کے چچا زاد بھائی جنہیں سرائے میں بارات کے قیام کے انتظام کو دیکھنا تھا وہ ترسک پہنچ گئے اور ان سب کو ایک ایسی بات بتانے لگے جو ان سب سے چھپائی گئی تھی لیکن جو وہ اپنی ہوشیاری سے بھانپ گئے تھے۔ کہ دو لہا بے شک شہپر ہی ہے لیکن نہ وہ کبھی فوجی رہا ہے اور نہ ہی وہ شجاعت میں کسی عام آدمی سے کہیں آگے ہوا ہو گا۔ وہ تو ایک جھکی کروالا تقریباً ”کبڑا“ جوانی کو خیر باد کہہ چکا پنجر سے بھی بدتر شخص ہے جو سولہ سالہ بنفشی گل کو بیاہنے آرہا ہے۔ جس لڑکے کو شہپر کہا گیا تھا وہ اس کا قریبی دوست ہے۔“

کریمہ خالہ نے شدت غم سے اپنے گھٹنوں کو تھام لیا اور رکوع صورت آہ و بکا کرنے لگیں۔

جلد ہی جب وہ اس صدمے سے باہر آئے تو غصے سے بھڑکنے لگے۔

”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ سنتاں والوں کو جرات کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے ساتھ یہ دھوکا کریں۔“  
بنفشی کے والد کا طیش سے کچھ ایسا حال ہو گیا کہ وہ کھڑے کھڑے کئی بار اتیوں کو چبا جائیں گے۔

”اب شادی کرنی ہی ہو گی۔۔۔ بارات سر پر ہے۔۔۔“



کس کس نے... یہ جاننا ضروری نہیں رہا۔ کس  
کس نے نہیں... یہ بھی۔



بارات آگئی اور سب نے خوش دلی سے اس کا  
استقبال کیا۔ نکاح کا وقت آیا تو سرپرست نے صرف  
اتنا کہا کہ لڑکی کا حقیقی نام دینار بنت رسول مصطفیٰ ہے  
اور یہ کہ دینار میرے مرحوم چچا زاد بھائی کی اولاد ہے  
میری بیٹی جیسی، بلکہ میری بیٹی ہی ہے۔ پیار سے ہم  
اسے بخشی گل کہتے ہیں۔

جو کبڑا بڑھالے آئے تھے انہیں لڑکی کے حقیقی  
اولاد نہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ مہتابی کو زلفیہ  
اور قمری گھر کے پیچھے اس میدان میں لے گئیں جہاں  
تور پر نان لگائے جارہے تھے اور جا بجا آگ پر کھانے  
پکائے جارہے تھے۔ مہتابی نے اسے اعزاز سمجھا کہ  
شادی کے گھر کے کھانے کو اس کی نگرانی میں دیا جا رہا  
ہے۔ گویہ مشکل کام تھا لیکن اسے اچھا لگا۔ وہ دینار کو  
چند لڑکیوں کے پاس بٹھا آئی تھی جواب دینار سے ہنس  
ہنس کر باتیں کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے دینار کے  
لباس کی دل کھول کر تعریف کی اور اس کے حسن کی  
بھی۔ وہ دینار سے شکوہ کر رہی تھیں کہ وہ ان کے  
گھروں میں کیوں نہیں آتی اور یہ کہ دینار کی آواز بہت  
پیاری ہے وہ انہیں کوئی گانا کیوں نہیں سناتی۔ وہ اب  
اسے یہ وعدہ دے رہی تھیں کہ وہ اس کے گھر آیا کریں  
گی۔ حدیثہ خالہ کچھ بھی کہیں وہ اسے اپنے ساتھ لے  
جایا کریں گی اور بہار میں دریا کنارے وہ سب مل کر  
بیٹھا کریں گی۔

دینار جس نے ساری دنیا کی ساری آوازیں مہتابی  
کے دہن سے سنی تھیں۔ سارے نظارے مہتابی کی  
بینائی سے ہی کیے تھے۔ اب اپنی سماعتوں سے سب  
سننے اور محسوسات سے محسوس کر کے دیکھنے لگی تو  
خوشی سے دیوانی ہونے لگی۔

کسی ایک نے اس کے سر پر ریشمی جالی کا گھونگھٹ  
ڈال دیا۔ اسے کہا گیا کہ وہ دلہن کی سہیلی ہے اور دلہن

کے پہلو میں بیٹھی ہے اپنے سر کو جھکا کر رکھ  
سنتاب والوں کی رسم ہے کہ دلہن کی سہیلی سے رہا  
پوچھتے ہیں کہ کیا اسے یہ نکاح قبول ہے جیسا کہ  
سرپرست سے اجازت لی جاتی ہے۔ یہ رسم دلہن کے  
لیے آسانیاں اور خوشیاں لاتی ہے اور سہیلی کے لیے  
بھی۔

دینار ہریات پر سر ہلاتی رہی۔ ”ٹھیک ہے... ٹھیک  
ہے... بخشی کی خوشی کے لیے سب کچھ... ہاں میں  
ایسا ہی کروں گی۔“

جس وقت حدیثہ خانم دوسرے گاؤں میں اپنے  
گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگانے ہی والی تھی اور  
مہتابی بڑے بڑے برتنوں کے ڈھکن اٹھا کر لذیذ  
کھانوں کو دیکھ رہی تھی کہ انہیں اب اور کتنا پکانا ہے  
اور ترسک گاؤں کے پہلو میں گرتی آبشار میں ایک  
سریل چڑیا کا مردہ جسم پانی کے ساتھ بہہ کر جتانوں سے  
نکلنے ہی والا تھا، ٹھیک اسی وقت دینار اپنے سر کو  
اٹبات میں ہلا رہی تھی تاکہ اس کی سہیلی، گاؤں کی  
دلہن کا نصیب اچھا رہے۔ وہ اپنے پیارے شوہر شہپر  
کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارے۔

اسے لگا کہ آج یہ شادی کا دن ختم ہو جائے گا تو اس  
کی زندگی کی عید ختم ہو جائے گی۔ وہ کس قدر خوش  
تھی کہ دلہن کے گھر والوں نے اسے یہ اعزاز دیا کہ وہ  
دلہن کی سہیلی بن کر دلہا والوں کی رسم ادا کرے۔ اس  
کا دل اس خوشی سے اتنا لبالب ہو گیا کہ اس نے  
محسوس کیا کہ وہ اتنی ہی خوش رہے گی تو وہ اندھی بھی  
نہیں رہے گی۔ وہ جلد ہی دیکھنے لگے گی بلکہ اس نے  
دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ گاؤں والوں کی اس محبت اور  
ایسے اعزاز نے اسے نور بخش دیا ہے۔ اسے نظر آ رہا  
ہے کہ کیسے دلہن تو تفرنگی رنگ اوڑھے شرم سے  
اپنے گالوں کو سرخ کر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں جھکی  
ہیں لیکن دراصل وہ اب ہی وا ہوئی ہیں۔ وہ دنیا میں  
کسی بھی منظر سے پہلے شہپر کو دیکھنا چاہیں گی اور بس  
اسے ہی... ٹھیک ہے وہ سب دیکھ رہی تھی۔ دلہن کی  
آبدیدہ آبدیدہ اور اتنی ہی زیادہ خوش ماں کو، بخشی کی



کرنے میں دیر نہ کرے۔ یہ تم نے اس معصوم کے ساتھ کیا کیا۔۔۔

دینار پر گھبراہٹ طاری ہوئی۔ ”بی بی کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا۔“ وہ اٹھ کر مہتابی کی سمت جانے لگی۔

مہتابی ان تماش بینوں کے جھرمٹ میں رونے لگی۔ اس نے مائمی انداز میں اپنے سر پر ہاتھ مارے۔

”دینار۔۔۔ میری بچی دینار۔۔۔ نفشی کو ایک کبڑا بڑھا دلوں بیاہنے آیا تھا۔۔۔ انہوں نے تمہارا نکاح اس سے کر دیا۔“

مہتابی کے بے صبر غم کے اس جواب نے دینار کو ایسی کامل خاموشی سے ہمکنار کر دیا جو لمحوں میں بوڑھا کر دیتی ہے اور اتنے ہی لمحوں میں مردہ۔۔۔

دینار نے اپنے گھونگھٹ کو ہاتھ سے الٹا۔ ”خالہ۔۔۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔“

دینار کا جس کا اصل اندھے پن سے اب واسطہ پڑ چکا تھا کی اس بات سے کئی کھی کھی کرنے لگے کہ اندھے گمہ رہی کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

مہتابی نے نفرت سے سب کو باری باری دیکھا، اسی نفرت کا مستحق خود کو بھی پایا۔ اس نے ایک نابینا کو جو بینائی عطا کی تھی وہ حقیقی بینائی کے خلاف ایک کھلا تضاد تھی۔ اسے بتا دینا چاہیے تھا، وہ سب جو حقیقی تھا، بیرام، نورو، نفشی اور گلنار، سلیمان اور یوسف، کریمہ اور زلفیہ، مویشوں کے باڑوں سے لے کر چوپالوں تک، قہوہ خانے سے لے کر شہر جانے والے راستے تک، اس گاؤں سے اس گاؤں تک، وہ سب کے لیے قابل نفیر تھی۔

”تم خدا کے عذاب کے مستحق بنو گے۔ تمہاری توبہ تمہیں اس عذاب سے کبھی بری نہیں کر پائے گی۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہیں بددعا میں دوں گی۔ تم ہمیشہ خدا کی ناراضی کے بوجھ تلے دفن رہو گے۔“

”خدا ہر بندے کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنا بدلہ لے لے۔“ یوسف نے کہا۔

وہاں کھڑے ترسک والوں نے یوسف کی تائید کی۔

ساری سہیلیوں کو جو اس کے چلے جانے کے خیال سے بس اب غم زدہ ہوئی ہی جاتی ہیں۔

گاؤں کے دوسرے بڑے بوڑھوں کو جو دیکھ رہے ہیں کہ ننھی نفشی گل اب نفشی خانم ہو گئی ہے۔ معتبر اور ہر حال میں قابل احترام۔ وہ سب دیکھ رہی تھی لیکن یہ نہیں کہ لڑکیوں اور عورتوں، مردوں اور بچوں کا جھرمٹ دراصل اس کے سر پر کھڑا ہے۔ نورو گل جو تسمخر سے ہنس رہی ہے اور سمنی گل، مغفرت، ایدین، گلنار اور ظریفہ جنہیں وہ اپنی سہیلیاں مانتی ہے۔ کریمہ اور زلفیہ خالہ جن کے وہ مہتابی کی طرح ہاتھ جوم کر آنکھوں سے لگانا چاہتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ پائی کہ قہوہ خانے کا مالک حاتم بھی ہے۔ جس کے لیے اس نے ایک بار دعائے صحت کی تھی اور یوسف، سلیمان، رائد اور بیرام بابا بھی جن کے بارے میں وہ یہ گمان نہیں رکھتی کہ وہ اس کے لیے کیسا خیال رکھتے ہیں۔

رکوع کے بل قیام کے لیے تیار مہتابی دینار کی طرف بھاگی آئی۔ نکاح کے بعد اس کی بہو نے تسمخر سے منٹے ہوئے مہتابی کو بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ وہ حدیثہ کے ہاتھوں اپنے انجام کے لیے تیار ہو جائے۔

”دینار! یہ تم نے کیا کیا؟ دینار۔۔۔“ مہتابی نے ایسے غم سے، جو صبر سے کبھی آشنا نہیں ہو پاتے، سے مچلتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا بی بی؟“ دینار نے جو ابھی بھی مسکرا رہی تھی، مہتابی کی آواز کی سمت دیکھنا چاہا۔ اسے لگا آج وہ پیاری مہتابی کی شکل ضرور دیکھ لے گی۔ وہ دیکھ لے گی کہ اس کی ماں سے زیادہ جس نے اس سے پیار کیا ہے وہ کیسی ہے۔ آج وہ اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگائے گی۔ بار بار ایسا ہی کرے گی۔۔۔

”دینار!“ مہتابی سکٹنے لگی اور اس پر ایسے رعبہ طاری ہو گیا جیسے اس کے پیروں تلے کی زمین قائم نہ رہنے پر مائل ہو۔

”یہ کیا کیا تم نے ملعونوں۔۔۔ خدا تمہیں غارت



کسی نے سر ہلا کر کسی نے آنکھوں کی چمک سے اور باقی سب نے اقرار سے نہ انکار سے۔ اور ان سب میں سب سے بڑے وہی تھے جو خاموش رہے نہ مدد کی نہ مذمت۔ وہ اچھوں میں ہوئے نہ بروں میں۔

ترسک ایک ایسا گاؤں جس کے بایوں کے چہروں پر خشکی کی تہیں جمی تھیں اور جن کی آنکھیں کینہ پروری سے آشنائی کے سبب اندر کودھنسی تھیں۔

”خدا انسان نہیں ہے۔۔۔ وہ مدد لے نہیں لیتا۔۔۔ وہ تمہاری طرح نہیں سوچتا۔۔۔ وہ ظلم کے موقع نہیں دیتا۔۔۔“ متابی چلا اٹھی۔

”بی بی مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔ متابی۔“ دینار اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کیا کیا ٹٹولنے لگی۔

متابی نے مزید نفرت سے انہیں دیکھا اور پھر سے خود کو۔ اسے کیا ضرورت تھی کریمہ کی منت کرنے کی کہ وہ دینار کو شادی میں آنے کی اجازت دے دے۔

”رخصتی کا تقاضا کیا جا رہا ہے جاؤ جا کر اس کی ماں کو خبر کرو۔“ بیرام بابا نے کہا جبکہ ہنسی گل کے بابا نے طیش سے باہر کی سمت لپک کر دولہا کے باپ کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا۔

”سنتاپ والوں اب یاد رکھنا دھوکے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ تم ایک کبڑا لے کر آئے تھے۔ ہم نے تمہیں آنکھوں کی اندھی تھمادی۔۔۔ جاؤ لے جاؤ اسے۔۔۔ اب اس بوجھ کو ساری عمر ڈھوتے رہو۔“

لڑتے لڑتے بات بہت دور نکل گئی شام ڈھل گئی۔ گاؤں کی کچی پگڈنڈیوں اور گلیوں میں دھول اڑاتا حدیثہ کا گھوڑا گزرتا چلا گیا، متابی غم سے بے حال حدیثہ کے پیچھے بھاگی۔

کبڑے دولہا کے باپ کو ایک اندھی لڑکی جو ایک امیر وہ کی بیٹی تھی کو قبول کرنے میں تامل نہ ہوا۔ اسے غصہ تھا تو بس اتنا کہ ترسک گاؤں کے مجمعے میں اس کا گریبان پکڑا گیا اور اس کے قابل احترام بیٹے کو کئی ایسے ناموں سے پکارا گیا جو کسی صورت ادائیگی کے لیے مناسب نہیں۔

ایک ایسی بارات جس میں دلہن بھی موجود تھی اور

ایک ایسا مجمع جس میں کوئی خیر خواہ موجود نہ تھا، کہ سرکنڈوں سے گھرے گھر کی طرف آئے جس کی دیواروں پر کہیں سے بھی کسی بھی چراغ کی روشنی نہیں پڑ رہی تھی نہ ترچھی نہ سیدھی۔

”مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔ متابی میری روشنی۔۔۔ میرا نور۔۔۔“ دینار وقفے وقفے سے بیڑی پڑی۔ اور اپنے گھر جہاں اس کی ماں اندھیرا لے بیٹھی تھی اور جس کی نشست کے پاس نیچے متابی بیٹھی اپنے آنسو بہا رہی تھی کی دہلیز پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔“ اس نے اتنا کہا اور رونے لگی۔

حدیثہ کے کپکپاتے ہاتھ سب نے دیکھے اور پھر اس نے گھونگھٹ کو ذرا سا الٹا۔ دینار کے کان کے پاس سفید بالوں کی ایک تازہ کائی جمی تھی جو زیادہ پرانی نہیں تھی بس یہی شام پڑھے سے شام ڈھلے کے کہیں درمیان وہاں کندھ ہو گئی تھی۔

”میں نے کہا تھا دینار۔۔۔ اب بھی تو ناپینا ہوئی ہو۔ پہلے تم نے ناپینا بنے رہنے پر اکتفا کیوں نہ کیا؟“ سنہری بال تیزی سے سفیدے کی لپیٹ میں آنے لگے۔

”جاؤ اپنے دولہا کے ساتھ۔۔۔ متابی دروازہ بند کر لو۔“

اور پھر۔۔۔ دینار خچر پر بیٹھی اپنے دولہا کے برابر سفر کرتی ”کتنا اندھیرا ہے۔۔۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔ متابی۔۔۔ ماں۔“ بیڑی تازہ جا رہی ہے۔ اور متابی حدیثہ سے کئی بار پوچھ چکی ہے کیا وہ چراغ روشن کر دے جبکہ وہ مسلسل ایک ہی جواب پارہی ہے۔

”نہیں! اب روشنی سے کسے سروکار ہے۔“ اور گاؤں سے گاہے بگاہے بندوقیں پہاڑوں کے رخ بلند کی جا رہی ہیں۔۔۔

”سب تعریفیں خدائے بزرگ و برتر کے نام“

